خدا کے ذہن میں دہشت: مذہبی تشدد کا عالمی پھیلاؤ

تبصرہ: جان ڈبلیو کرٹزر *

ترجمہ:مریم یونس

Mark Juergensmeyer, *Terror in the Mind of God: The Global Rise of Religious Violence,* University of California, Berkeley and London, 2001, 316 pages, £11.9.

۱۱ستمبر۲۰۰۱ء کو نیویارک شہر میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور واشنگٹن میں پینٹاگون پر ہونے والے حملوں نے اس ضرورت کو اجاگر کیا ہے کہ دہشت گرد رہنماؤں اور ان کے پیشواؤں کے محرکات پر کثیر جہتی تحقیق کی جائے۔ ایک جید ماہر سیاست مارک جیورگنز مئر نے دہشت گردی کے نفسیاتی، مذہبی اور معاشرتی پہلوؤں پر بالکل اچھوتے انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ زیرِ نظر کتاب سے پالیسی سازوں اور عام شہریوں کو بنیاد پرست دہشت گردی کو مذہبی اور عالمی تناظر میں سمجھنے میں مدد ملے گی۔

مصنف نے ایشیا سے امریکہ تک اکثر ذاتی انٹرویوز کی بنیاد پر تیار کی گئی کیس اسٹڈیز کے ذریعے واضح کیا ہے کہ دہشت گرد اکثر اپنی کارروائیوں کو بدھ مت، عیسائیت، ہندومت، اسلام ازم، یہودیت اور سکھ مذہب کی ذاتی تشریحات کے ذریعے درست قرار دیتے ہیں۔ بے شک کہ دہشت گرد تنظیمیں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں لیکن ایک بات جو ان سب میں یکساں موجود ہے وہ ثقافتی اقدار، آزادی، انسانی انفرادیت اور مادہ پرستی کے جدید تصورات کی نفی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ مصنف نے یہ سمجھنے میں بھی دیر نہیں لگائی کہ بے شک مذہبی بنیاد پرستی پر مبنی بعض دہشت گرد تنظیمیں قدیم مذہبی روایات کی طرف واپسی کا مطالبہ کرتی ہیں لیکن یہ بھی واضح ہے کہ وہ

* John W. Critzer, "Terror in the Mind of God: The Global Rise of Religious Violence", *Conflict, Security & Development,* 2:3 2002, pp 153-156.

نئی روایات کو اپنے مفاد کے تحت نئی ترتیب دینے کی کوشش کر رہی ہیں۔ بحرحال دہشت گرد تنظیمیں جدیدیت اور عالمگیریت کے بعض بعض پہلوؤں سے استفادہ کرنے پر بخوشی آمادہ ہیں، مثلاً عالمی مواصلاتی ذرائع، بین الاقوامی مالیات اور جدید ہتھیار۔

سوال یہ ہے کہ جدت پسندی نہ صرف دہشت گردوں بلکہ مذہبی حلقوں، نسلی گروہوں اور کئی دوسرے معاشرتی کرداروں کی طرف سے اعتراضات کی زد میں کیوں ہے؟ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ امریکہ اور سابق سوویت یونین کے درمیان سرد جنگ نے ان گروہوں کی اکثر تنقید اور تشویش کی آوازوں کو دبا رکھا تھا۔ سرد جنگ کے اختتام کے بعد ریاست کا کردار اور قوم پرستی کا تصور کچھ نسلی اور مذہبی گروہوں اور ان مبصرین کی شدید تنقید کا نشانہ بنا جن کے خیال میں عالمگیریت کے اس دور میں ریاست کا تصور بالکل فرسودہ ہے۔ جیسا کہ جیورگنز میئر بیان کرتا ہے:

> ''سرد جنگ نے اخلاقی سیاست کے تقابلی ماڈل —— کمیونزم اور جمہوریت —— پیش کیے جن کی جگہ عالمی منڈی نے لے لی جس نے قومی خودمختاری کو نقصان پہنچایا اور جو واضح طور پر سیاسی اعلیٰ معیار سے خالی ہے'' (ص ۲۲۵)۔

شہریوں کو ریاست سے بدگمان کرنے میں ایک بڑا ہاتھ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک میں بڑھتی ہوئی سیاسی کرپشن کا ظہور ہے۔

مذہبی بنیاد پرستوں کو خاص طور پر اس طریقہ کار پر تشویش ہے جس سے لادینی ریاستیں بہت سی ناگوار ثقافتی اور اخلاقی اقدار کی اپنے قوانین اور پروگراموں کے ذریعے پشت پناہی کرتی ہیں۔ اسلامی ممالک میں لادینی ریاستوں کا ظہور اور اسقاطِ حمل کو قانونی قرار دینا اور اس قسم کے دیگر واقعات کی وجہ سے کچھ مذہبی بنیاد پرستوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان کے پاس دینی جدوجہد میں دہشت گردی کے استعمال کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔

جیورگنز میئر کے خیال میں اس قسم کے اعتقادات ایک کائناتی جنگ کی بنیاد بن سکتے ہیں:

''وہ ماضی کے عظیم جنگی معرکوں کی یاد تازہ کرتے ہیں اور ان سے اچھائی اور برائی کا ازلی تعلق جوڑتے ہیں'' (ص ۱۴۶)۔ ایسی جنگ جس میں کسی کی شناخت خطرے میں ہو اور زبردست قوی دشمن

کے خلاف کامیابی کے امکان بالکل نہ ہوں تو ایسے میں صرف مذہبی علامتوں کے استعمال اور دیومالائی طاقتوں کے ذریعے ہی فتح یاب ہوا جا سکتا ہے۔ کائناتی جنگ کے خیال سے ملتا جلتا ایک تصور فریقِ مخالف کو شیطانی قرار دینا ہے۔ جیورگنز میئر کے خیال میں ''اس کا مقصد اپنے مدمقابل کی طاقت کو کم کرنا اور اسے بدنام کرنا ہے۔ ان کو نیچا دکھانے سے اور ان کی تذلیل کرنے سے —— ان کو انسانیت سے کم تر بنانے سے —— انسان کا مقصد صرف اپنی اخلاقی قوت کی برتری پر ڈٹے رہنا ہوتا ہے'' (ص ۱۸۳)۔ ایسا کرنے سے دشمن ایک ایسی بے حس مخلوق میں تبدیل ہو جاتا ہے جس کے خلاف دہشت گردی قابلِ قبول ہو جاتی ہے۔

جہاں تک ان افراد کے انفرادی محرک کا سوال ہے جو دہشت گرد تنظیموں میں شامل ہوتے ہیں تو اس بارے جیورگنز میئر کا خیال ہے کہ بعض مردوں کے نزدیک جدت پسندی کے نتیجے میں روزگار، جنسی تعلقات اور معاشرتی ماحول پر قابو پانا مشکل ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر تیسری دنیا کے بیش تر ممالک میں روزگار کا تعلق شادی سے ہے اور بغیر نوکری یا ازدواجی ساتھی کے آدمی معاشرے کا اضافی رکن بن جاتا ہے (اسی طرح ترقی یافتہ صنعتی ممالک میں روزگار اور معاشرتی مقام آپس میں گہرا تعلق رکھتے ہیں)۔

چنانچہ جیورگنز میئر دلیل دیتا ہے کہ ''دہشت گردی کے افعال کو مردوں کے نزدیک علامتی قوت و اختیار کی شکلیں کہا جا سکتا ہے جو معاشرے میں اپنے روایتی جنسی کردار —— یعنی اپنی مردانگی —— کو خطرے میں محسوس کرتے ہیں'' (ص ۱۹۵)۔ لیکن پھر بھی مصنف کا مشاہدہ ہے کہ دہشت گردی کی کارروائیوں میں حصہ لینے والے تمام افراد یہ رجحان نہیں رکھتے بلکہ ایسے دہشت گرد بھی ہیں جو باقاعدہ درسگاہوں سے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اور کسی پیشہ ورانہ عہدہ پر فائز ہوتے ہیں، اس ضمن میں ۱۹۹۳ء میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ کرنے والے دو افراد کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔

دہشت گردی اور سماجی علیحدگی کی آپس کی نسبت کو ترقی یافتہ اور ترقی پذیر دنیا کے سیاست دانوں اور پالیسی سازوں کے معاملے میں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ عالمگیریت کے روز افزوں رجحان کی وجہ سے ثقافت، معاشیات اور معاشرتی تعلقات کا مستقبل غیر محفوظ ہو رہا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ عالمی تبدیلی لازماً دہشت گردی کا سبب بنے گی، لیکن اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بہت سے ملک مسلسل بدامنی کا

شکار ہیں، خاص طور پر اگر مذہبی اور نسلی گروہ جو طاقت اور دہشت کا استعمال کرنے پر آمادہ ہیں، تیسری دنیا کے افراد کو تربیت دینا شروع کر دیں جنہوں نے ابھی تک صنعتی ترقی سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ مصنف کے خیال میں:

''مذہبی تشدد کے مرتکب (افراد یا تنظیمیں) کمزوروں کی جانب سے طاقت کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہیں اور ان اصولوں کے برخلاف جن پر لادینی ریاست قائم ہے اس کو عمومی امن کے لیے جائز قرار دیتے ہیں'' (ص ۲۱۵)۔

مصنف کی دلیل ہے کہ بنیاد پرست تشریحات سے تحریک پانے والی دہشت گردی ایسا حربہ نہیں ''جس سے کوئی فوری، قابل فہم یا بامقصد لائحہ عمل حاصل کرنا مقصود ہو بلکہ ان ڈرامائی واقعات کا مقصد ان کی علامتی اہمیت کو اجاگر کرنا ہوتا ہے'' (ص ۱۲۳)۔ مثال کے طور پر اوکلاہاما میں فیڈرل بلڈنگ جس کو اپریل ۱۹۹۵ء میں بمباری کا نشانہ بنایا گیا، امریکہ کی طاقت کی نشانی کے طور پر سمجھی جاتی تھی۔ پھر بھی بعض اوقات دہشت گردی کا کوئی باقاعدہ مقصد بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ پیرو کی دہشت گرد تنظیم ''ٹوپک امارو'' نے اپنے کچھ ساتھیوں کی جیل سے رہائی کو یقینی بنانے کے لیے کچھ لوگوں کو یرغمال بنالیا۔ بہرحال اپنے رویے سے سیاسی یا علامتی رجحان کا اظہار دہشت گردوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعات نے امریکہ کو مجبور کیا کہ وہ عوام کی کمزور پڑتی ہوئی رضامندی کے برخلاف بھی اپنی سالمیت کے لیے طاقت کا استعمال کر کے دہشت گردی کا مقابلہ کرے۔

جیورگنز میئر اس بحث پر اختتام کرتا ہے کہ دہشت گردی کو ختم کرنے کے ممکنہ طریقے کیا ہو سکتے ہیں؟ دہشت گردی کو قابو کرنے کا پہلا طریقہ اس کے خلاف طاقت کا استعمال ہے۔ اس طریقہ کار کو اگر مرحلہ وار طور پر اپنایا جائے، لیکن اس سے شدید ردِعمل اور جوابی حملوں کا خدشہ ہے۔ جبکہ اس کے لیے مسلسل ایک لمبے عرصے کے لیے مکمل جنگ سے وابستگی کی ضرورت ہے۔ دوسرا طریقہ ان سے سختی سے نبٹنے کی شدید دھمکی ہوسکتی ہے، لیکن اپنے مقصد سے پختہ وابستگی رکھنے والے پرجوش افراد پر اس کا کم ہی اثر ہوگا۔ تیسرا امکان یہ ہے کہ دہشت گردوں کو فتح ہو جائے۔ لیکن جیسا کہ مصنف نے پرزور طریقے سے بیان کیا ہے کہ شاذ و نادر ہی دہشت گردی کی کارروائی طاقت کی تبدیلی میں کامیاب ہوتی ہے۔ اس نے

اس حقیقت کو بھی واضح کیا کہ اگر دہشت گرد اپنی کارروائیوں کو جاری رکھیں گے تو عوام کی حمایت سے محروم ہو جائیں گے۔ جیسا کہ اگست ۱۹۹۸ء میں رئیل آئرش ریپبلکن آرمی کی اوماغ کے قصبہ پر بمباری کے نتیجے میں دیکھا گیا۔

چوتھے طریقہ کار کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس مسئلہ کے سیاسی نقطۂ نظر کی جانب توجہ مبذول کی جائے جبکہ اس کے مذہبی پہلوؤں کو بحث سے خارج کر دیا جائے۔ اس طرح سے شاید اس معاملہ کا بہتر تصفیہ ممکن ہو۔ جیورگنز میئر کے مشاہدہ کے مطابق بعض مسلم مفکرین نے مذہب کو سیاست سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی ہے، جیسا کہ ایرانی مفکر عبدالکریم سروش کے مطابق نظریہ اور مذہب دونوں بالکل مختلف النوع ہیں۔ مزید برآں وہ مسلم مذہبی رہنماؤں کے سیاسی کردار کے بھی مخالف ہیں۔

آخر میں مصنف تجویز دیتا ہے کہ جن حکومتوں کو دہشت گردی کا خطرہ ہو ان کو چاہیے کہ وہ مذہبی اقدار پر مبنی اخلاقی بالادستی کا مظاہرہ کریں، تو پھر شاید اس مسئلہ کا کوئی مناسب اور منصفانہ حل سامنے آ سکے گا۔ شدت پسندی کو ختم کرنے کے لیے مذہب کا استعمال کرنا ایک اور مناسب طریقہ ہے۔ لیکن اس کے لیے دو طرفہ طور پر کسی نہ کسی سمجھوتہ کو منظور کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن سمجھوتہ پر پہنچنا اس بات پر منحصر ہے کہ دہشت گرد اپنی شدت پسند کارروائیوں کا سدباب کرنے پر راضی ہوں۔ جیورگنز میئر کی یہ امید کہ مذہبی شدت پسندی ختم ہو جائے گی، اس بات سے منسلک ہے کہ عوامی زندگی میں مذہب کو ایک لازمی اخلاقی طاقت کا مقام دیا جائے اور نتیجتاً یہ بھی کہ مذہبی انتہا پسندی اعتدال پذیر ہو۔

بدقسمتی سے سرد جنگ کے بعد اور عالمگیریت کے زمانہ میں دہشت گردی کافی حد تک زندگی کا حصہ بن چکی ہے۔ ۱۱ ستمبر کے واقعات کا تو کیا ذکر کریں یہ اکثر ترقی پذیر ممالک مثلاً بھارت میں سکھ علیحدگی پسندوں کی شکل میں بھی موجود ہے، یا ترقی یافتہ صنعتی ملک جاپان میں اوم شنر کیو نے جب ۲۰ مارچ ۱۹۹۵ء کو ٹوکیو سب وے پر زہریلی گیس چھوڑ دی۔ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر دونوں ممالک اس وقت تذبذب کا شکار ہیں کہ کیسے نہ صرف دہشت گردی کو ختم کیا جائے بلکہ ملکی اور بین الاقوامی بدامنی سے بچنے کے لیے دہشت گردی کی نمو کا سدباب کیا جائے، تاکہ محدود ذرائع کو عوام کی بہتری کے لیے استعمال کیا جا سکے۔

دہشت گردی کے خاتمہ میں جیور گنز میئر کا کردار یہ ہے کہ اس نے مذہبی علامتوں کے استعمال اور تشدد کے درمیان رشتہ کو واضح کیا اور اس کے ساتھ ہی بہت سے ایسے دہشت گردوں کے سماجی اونفسیاتی محرکات کو نمایاں کیا ہے، جو جدید دنیا میں ذلت و پشیمانی اور علیحدگی کا شکار ہیں اور اپنے غموں کا ازالہ بنیاد پرست اخلاقی اصولوں سے کرنا چاہتے ہیں، جن میں انہیں دہشت گردی کا جواز ملتا ہے۔

جیور گنز میئر کی دلیل یہ ہے کہ مذہبی اور اخلاقی اقدار پر زیادہ انحصار بنیاد پرست دہشت گردی کو ختم کرنے میں مدد و معاون ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اقتصادی عوامل کو اور ان لوگوں یا گروہوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جو معاشرتی مسائل سے فائدہ اٹھا کر اپنی سیاسی طاقت کو بڑھانا چاہتے ہیں۔

[جان ڈبلیو کرٹزر کنیکٹکٹ سٹیٹ یونیورسٹی میں سیاسیات کے پروفیسر ہیں۔]